ترجمہ
از جناب محمد المبارک

ایک نسل کی داستان

ہماری موجودہ مخلوط نسل نے ایک نہایت گہرا، دور رس اور پہلو دار تجربہ حاصل کیا ہے کیونکہ اس نے اُس وقت ہوش سنبھالا جب پہلی عالمگیر اپنے پیچھے کئی طرح کے اثرات چھوڑ گئی تھی۔ جنگ کے بعد اس کے نتائج کھل کر سامنے آچکے ہیں اور اس سے پہلے جو سرگرمیاں، باہمی اقدامات اور ایک دوسرے کو کمزور کرنے کی کوششیں مشرق و مغرب میں رونما ہوئیں ان کے نتائج بھی ظاہر ہو چکے ہیں۔

ہماری اس نسل نے اور بالخصوص ان لوگوں نے جنہیں واضح طور پر مشاہدہ کرنے کے مواقع ملے، وہ سارے معرکے اور تغیرات اور ترقی کی صورتیں ملاحظہ کیں جو ثقافت و سیاست کے میدانوں میں اختیار کی گئیں اور جنہوں نے شہروں اور دیہات کے مختلف حالات کو متاثر کیا۔

ہم نے گزرنے والے زمانے کو بھی دیکھا اور آنے والے دور کو بھی۔ اور اس مستقل تحریک کا جائزہ بھی لیا جو ہمارے آگے پیچھے، ترقی اور بیداری کے نام سے ہمارے حواس کو متاثر کر رہی تھی مگر ہم ان الفاظ کے حقیقی مفہوم کو نہ سمجھ سکے۔

ہم نے فصیح اور عامی زبانوں میں معرکے برپا ہوتے دیکھے۔ عربی قومیت اور فرعونی اور علاقائی قومیت کو باہم دست و گریباں پایا۔ دین اور لادین، آزادی و استعمار میں شدید کشمکش دیکھی۔ جب ہم مکتب میں زیر تعلیم تھے اس وقت مشاہدہ کیا کہ ہماری مثالی شخصیتیں، ہماری اقدار، ہماری تہذیب، ہمارا دین اور ہماری زبان — الغرض ہر چیز میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے جا رہے ہیں، اور ہمیں اپنے دفاع سے بے گانہ کرنے کے لیے بیرونی علمی اور سیاسی حلقوں کی مدد سے زور دار کوششیں کی گئیں۔ پھر ہم نے یہ بھی دیکھا کہ کس طرح ان انقلابی تحریکوں اور سرگرمیوں سے پردہ اٹھ گیا اور حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ اور بہت سے توڑ پھوڑ اور تخریب کے علمبردار اُس کام سے باز آگئے — جی بھر جانے

سے یا مصلحت کی بنا پر ـــــ جس میں وہ لگے ہوئے تھے۔

ہمارے مخصوص عربی معاشرے نے جس پر اسلام کا عمومی رنگ بھی چڑھا ہوا ہے اپنے اندر حرکت اور بیداری پیدا کرنے کے لیے اجنبی اور غیر ملکی خون سے مدد چاہی اور بالآخر اس بدیشی خون کی بدولت اس میں زندگی کی حرکت و حرارت پیدا ہوئی۔ یوں ہمارا معاشرہ نشاۃ ثانیہ سے ہمکنار تو ہوا لیکن بہت سی نامعلوم نئی آفات بھی اسے لاحق ہوگئیں۔ اس طرح مشرق کا مغرب سے تعلق قائم ہونے کے بعد گزشتہ دو صدیوں کے دوران دیگر مذاہب اور فلسفوں کے مختلف اثرات یکے بعد دیگرے ہم پر وارد ہوئے اور ہم نے بھی ان میں سے ہر ایک کا کچھ نہ کچھ رنگ قبول کیا۔

ہمارا معاشرہ ابتداءً اٹھارویں اور انیسویں صدی میں دولتِ عثمانیہ اور مصر کی وساطت سے، فرانسیسی تمدن سے روشناس ہوا جب یہ تمدن پورے عروج پر تھا۔ اس تمدن کی نظر میں فردِ انسانی ہی وہ بنیادی اکائی اور بلند ترین اہمیت کی حامل شے تھی جسے سیاسیات، اقتصادیات اور اخلاق کی اساس قرار دیا گیا۔ انگریزی تہذیب و تمدن کے بھی ایسے ہی اثرات اسلامی معاشرے پر مترتب ہوئے۔ اور ہم سیاسی میدان میں جمہوریت کے نمائندہ نظام سے متعارف ہوئے اور معاشی میدان میں آزاد سرمایہ دارانہ نظام سے۔ دین و اخلاق کے دائرے میں بھی ان مغربی نظاموں کے بہت سے افکار و خیالات اپنانے لگے۔ یہاں تک کہ فرانس میں تاریخ نے کروٹ لی اور علمانی[1] تحریک زور پکڑ گئی جو حکومت اور اس کے نظام سے دین کو بالکل الگ کر دینا چاہتی تھی۔ اور اخلاقیات میں فرد کی مکمل آزادی کی علمبردار تھی۔ حد یہ کہ معروف اخلاقی اقدار کی پابندی بھی اس کی نظر میں ضروری نہ تھی۔ صرف نظریۂ وطنیت ہی ایک ایسا رابطہ تھا جو افراد کو معاشرے سے ملا کر رکھتا تھا۔ اور اسی ایک محور کے گرد تمام امورِ عامہ، خارجی سیاست اور اجتماعی سرگرمیاں گھومتی تھیں۔

اس کے بعد انیسویں صدی میں جرمنی ثقافت کے زیرِ اثر ایک دوسری لہر اٹھی جو دولتِ عثمانیہ کے عہد میں براہِ راست یا بالواسطہ ہم تک پہنچی۔ دولتِ عثمانیہ کے جرمنی سے اُس وقت مضبوط تجارتی، ثقافتی اور فوجی روابط استوار تھے۔ اس تہذیب و ثقافت میں اساسی حیثیت فرد کے بجائے قوم کو حاصل تھی۔ نتیجۃً اسے بقا بھی میسر رہی۔ استحکامِ معاشرہ اور ارتقائے سرمایہ کی ہوس اس کی مشترک اور موروثی خصوصیات

---

[1] علمانیہ ایک ایسی تحریک تھی جس کے قائل تمدنی، سیاسی اور اجتماعی زندگی میں دینی اقدار کی پیروی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے (مترجم)

نہیں۔ رہے دستور اور قوانین تو وہ تمام ترانہی امور سے عبارت تھے اور ہر فرد پر لازم تھا کہ وہ ان مثالی لوگوں کی پیروی کرے جو اس تہذیب و ثقافت کے پرتو تھے۔ تو اس طرح نظریۂ قومیت نے ثقافتی اور مادی دونوں پہلوؤں سے وطنیت کی جگہ سنبھال لی۔ یا اس میں اس کا ادغام و اتصال ہوگیا۔ اور شعبہ ہائے تعلیم و سیاست و اقتصادیات کی طرح جماعتیں اور تحریکیں بھی اسی نظریۂ قومیت کے رنگ میں رنگی جانے لگیں۔ جس طرح اس سے پیشتر یہ تمام ادارے اور گروہ نظریۂ وطنیت سے متصف اور متاثر تھے۔ اور قانون سازی اور سیاسی امور کی بنیاد، آزادیٔ فرد کے بجائے مصلحتِ قومی قرار پائی۔ فرد کو نواُلٹا قومی مفاد کے تحت مختلف ضابطوں میں کس دیا گیا۔ غور و فکر کے اس نئے انداز سے عرب اور ترک دونوں یکساں طور پر متاثر تھے۔

پھر ایک تیسری تحریک اشتراکیت کے نام سے اٹھی اور اس سے ہماری مراد فوریر اور سینٹ سائمن کی اشتراکیت نہیں بلکہ مارکسی اشتراکیت ہے تو اس سے ہماری سوسائٹی کے اقتصادی اور سیاسی گوشے ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ فکری اور اعتقادی پہلو بھی تغیر پذیر ہوئے۔ بظاہر اشتراکی فکر، متعدد رنگوں والی فرانسیسی ثقافت کے ساتھ وارد ہوئی اور اس کی صورت یہ تھی کہ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد بہت سے ثقافتی وفود اور کتب و رسائل آنے شروع ہوگئے لیکن اس سب کچھ کے باوجود دوسری عالمگیر جنگ تک ہمارے اسلامی معاشرے میں اشتراکی اثرات کمزور ہی رہے۔ جنگ کے بعد ایک طرف مغربی استعمار کے ظلم و استبداد میں اضافہ ہوگیا۔ اور دوسری طرف فاتح عظیم اشتراکی حکومت نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور مشرقی اسلامی ممالک کے لیے اپنا آغوش وا کر دیا۔ دوستی کے جذبات ظاہر کیے اور مدد کے طور پر ان کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنے میں خاصی عجلت کا مظاہرہ کیا۔ نیز بین الاقوامی معاملات میں یہ اشتراکی ریاست بعض عربی اور اسلامی ملکوں کی حمایت میں ان کے پہلو بہ پہلو کھڑی ہوگئی۔ کیونکہ یہ خود اس کے اپنے مفاد میں تھا۔ اس طرح روسی حکومت کی پالیسی اور غلط کار حکومتوں کے پیدا کردہ خراب حالات سے اشتراکیت کے علمبردار ـــــ جو اسلامی سوسائٹی کے ہی افراد تھے ـــــ فائدہ اٹھانے لگے اور شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ اس دعوے کے ساتھ اس مذہب باطل کی طرف لوگوں کو بلانا شروع کر دیا کہ گویا یہی وہ نظام ہے جو قوم کو موجود خرابیوں، ہونے والے مظالم اور غلط کار حاکموں سے نجات دلا سکتا ہے۔

یہ تحریکات اور رجحانات جن کا ہم نے ذکر کیا ہے اسلامی معاشرے میں خاموشی سے آنے والے کسی طفیلی کی طرح داخل ہوتے ہیں نہ زبردست دشمن کی طرح۔ بلکہ ان کا داخلہ ایسے معین و مددگار کی حیثیت سے

ہے جسے مدد کے لیے بلایا گیا ہو دوسرے لفظوں میں ایسے کھانے کی حیثیت سے جسے بھوکے کے پیٹ میں پہنچنا ہو یہ دیکھے بغیر کہ اس کھانے کی نوعیت کیا ہے؟

اس کا سبب یہ ہے کہ ہم تک پہنچنے والا ہر فکر و فلسفہ ایسے موافق حالات میں وارد ہوا جب لوگ اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتے تھے۔ مثلاً نظریۂ وطنیت اس وقت ہماری طرف بھیجا گیا جب ہم امورِ حکومت میں مشاورت اور سیاسی میدان میں حریتِ فرد کے ضرورتمند تھے۔ اور خاکِ وطن اور قومی جماعت سے ربط رکھنا ہمارے لیے ضروری تھا کیونکہ افراد میں منقسم ہو جانے کے بعد ہم ان سے منسوب تھے۔ اسی طرح نظریۂ قومیت اس وقت درآمد ہوا جب عرب ترکوں سے جدا ہونے کے لیے کوئی اچھا جواز تلاش کر رہے تھے۔ کیونکہ عرب اور ترک دونوں رشتۂ دین میں منسلک تھے نیز یہی وہ دور تھا جس میں نوخیز ترکیہ کی "حزب الاتحاد والترقی" اس امر کے لیے کوشاں تھی کہ عربوں پر ترکوں کی حکومت مسلط رہے اور ایسی اسلامی حکومت قائم نہ ہو جس میں برابری کی بنیاد پر مختلف قومیں شریک ہو سکیں، تو اس وقت عربوں کا قومیت کی طرف مائل ہو جانا درحقیقت ایک ردِعمل تھا جسے مختلف خارجی عوامل نے تقویت بخشی اور اس سے اپنے مفادات کی تکمیل کی۔ بعدازاں بعض دوسرے اسباب و محرکات نے عربوں کے اس قومی رجحان کو ایک متعین فلسفے (نظریۂ قومیت) کی صورت دے دی۔ اور ایسے ہی اشتراکیت کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ تحریک ان حالات میں پروان چڑھی جب لوگ اپنے اقتصادی حقوق حاصل کرنے کے لیے اٹھ بیٹھے۔ اور جس زمانے میں عربی قوم اور بعض اسلامی ملکوں کا مفاد بین الاقوامی سیاست کے نقطۂ نظر سے اُس بلاک کے ساتھ وابستہ تھا جس میں اشتراکی حکومتیں موجود تھیں۔ تاہم یہ ایک الگ چیز ہے اور مارکسی فکر و فلسفہ کو قبول کر لینا بالکل دوسری چیز۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ان طوفانی تحریکوں نے مناسب مواقع اور سازگار اجتماعی حالات سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور اس سنہری موقع کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا کہ اسلام جس کی بساط اقتدار تنزل و انحطاط کے زمانوں میں عمومی زندگی کے میدان سے اُلٹ چکی تھی۔ اور اس کے ارفع و اعلیٰ اجتماعی اصول اور بڑے بڑے امتیازی شعائر اور عوام الناس کے درمیان جہالت کے دبیز پردے حائل ہو گئے۔ اور اس کی تعلیمات میں عجیب و غریب آمیزشیں ہوئیں اور انہیں مسخ کر کے پیش کیا گیا۔ نتیجۃً اسلام صرف مسلمانوں میں ہی سمٹ کر رہ گیا۔ اور یورپی تصور کے مطابق ایک کمزور سا مذہب قرار پایا جو دوسرے جہان سے تعلق رکھنے والے چند عقائد کا مجموعہ ہے اور عبادات کے طور طریقوں پر مشتمل ہے۔ اور اسلام

کا وہ غلبہ و طاقت والا مفہوم جو نوعِ انسانی کی آزادی کا ضامن تھا اور وہ اجتماعی مفہوم جو عدل و انصاف سے معمور خوشحال معاشرہ کے قیام سے عبارت تھا ــــ تو یہ حقیقی تصوّراتِ اسلام یا مٹ چکے ہیں یا مٹنے کے قریب ہیں یا کم از کم انہیں زندگی سے بے تعلق سمجھ کر ثانوی حیثیت دے دی گئی ہے۔

جب کبھی اسلام نے انگڑائی لی اور دوبارہ اپنی قوت و طاقت، طہارت و پاکیزگی اور دوسرے گہرے اصول و مفاہیم کا احیاء چاہا۔ اور اپنے دائرۂ اثر کو اجتماعی زندگی پر محیط کرنے کی کوشش کی، اور دینِ حق کی ننھی کونپل پھوٹ کر اور قدرے نشوونما پا کر مشکلات و مصائب کے ازالہ میں مخل خارجی تحریکوں کی جگہ لینے کے قابل ہوئی تو مخالفت کی تند و تیز لہریں بن کر ان تحریکوں نے اپنے آپ کو مستحکم کیا اور اس کونپل کے مقابلہ میں ان کا مضبوط عصا وجود میں آیا اور ان پر غلبہ پانا ایک ایسا مشکل کام بن گیا جس کے لیے مناسب تیاری لمبا وقفہ چاہتی ہے۔

اور اس طرح یہ فکری تحریکیں پے در پے اٹھیں اور ایک دوسری سے ملتی چلی گئیں اور ہمارے اسلامی معاشرے میں ان کے قدم جمتے گئے۔ ان کی ابتداء تحریکِ وطنیت سے ہوئی جس کا بنیادی کام فرد اور اس کی آزادی کا تحفظ تھا۔ اس کے بعد قومیت کے لیے راہ ہموار ہوئی جس کے سامنے قوم کی تقدیس اور اس کے لیے تعصب کی پرورش کا کام تھا پھر اشتراکیت کی باری آئی جس کے اوّلین مقاصد اقتصادی طور پر وسائلِ پیداوار کو قومیانا اور انفرادی ملکیت کو معطل کرنا، سیاسی طور پر اشتراکی فوجی کیمپوں سے رہ و رسم پیدا کرنا اور نظریاتی طور پر مادیت کا پرچار کرنا ہیں، اُس مادیت کا پرچار جو ہر موجود کی بقا و ارتقاء کو جدلیاتی قانون کا اقتضاء قرار دیتی ہے۔ جو اخلاقیات اور مذاہب کے علمبرداروں کو اجتماعی ترقی کے ثمرات میں سے سمجھتی ہے لیکن ایسے ثمرات جو اس کے خیال میں بدترین ہیں اور ذائقے میں نہایت کڑوے۔

ان افکار و نظریات کی بنیاد پر، عربی اور اسلامی ممالک میں بہت سی فکری تحریکیں اور سیاسی جماعتیں وجود میں آگئیں نیز خیالات اور عقائد میں خلفشار اور معاشرے میں انتشار پیدا ہوا اور ایسی مشترک بنیاد مفقود ہو گئی جو ایک قوم سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو اندرونی طور پر متحد کر سکتی اور مسلم اقوام کو آپس میں بھی ملا کر رکھ سکتی۔ یہ فقدان اس حد تک بڑھ گیا کہ تعاون و توافق کی کوئی ایک قریب ترین اور ناگزیر شکل بھی سامنے نہ آ سکی جس کی بدولت امتِ مسلمہ حقیقتاً ایک اُمّت بن جاتی اور جس کے بغیر مسلم قوم محض افراد اور گروہوں کا مجموعہ نظر آتی ہے۔

ان حالات سے جب معاشرہ کے سیاسی اور ثقافتی حلقے دوچار تھے، اُس وقت بھی عامۃ الناس کی ایک بڑی اکثریت اُس نظریۂ اسلامی کے لیے مخلص رہی جو معاشرہ میں جڑ پکڑ چکا تھا اور گذشتہ دور کے لمبے عرصے کے دوران خوب مضبوط ہو چکا تھا۔ اور مسلسل زندہ چلا آرہا تھا۔ اس نے ہمارے معاشرہ کے اکثر افکار و مقاصد متعین کیے۔ عادات و اطوار اور ربط باہمی کو جنم دیا، اس کی بلند شخصیات اور گراں قیمت اقدارِ اخلاق کو وجود بخشا اور بلاشبہ یہ سب کچھ اسلام ہی کا مرہونِ منت ہے۔ اور اسلام ہی کے ثمرات ہیں۔ چاہے ان کی کوئی سی شکل اور کوئی سا تصوّر سمجھا جائے۔ مزید برآں یہ حقیقت ہے کہ جدید افکار و نظریات سے ہمارے معاشرے کے مذکورہ امور متاثر ہوئے ہیں۔ ابتداءً یہ تاثر سطحی اور محدود تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کی قوت میں اضافہ ہوتا گیا۔

تاہم جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ اسلام کے اصولِ فکر و نظر اور مظاہر تہذیب و تمدّن میں تبدیلی و ترمیم اور انحراف کے بہت سے عوامل کارفرما رہے جنہوں نے اس کے رخِ زیبا کو کسی حد تک مسخ کر ڈالا، اس کے بعض پہلوؤں کو ناقص بنا ڈالا اور اس کے معیار بدل کر رکھ دیئے اور ان کارستانیوں کی بدولت اسلام کی سرگرم اور فعال حیثیت میں بڑی حد تک تعطل پیدا کر دیا۔ نتیجۃً اسلام موجودہ دور کو اُن ثمرات سے مالا مال نہ کر سکا جو اپنی صحیح صورت اور اپنے دورِ عروج میں دنیا کو دے چکا تھا۔ مگر ان ناسازگار حالات میں بھی اسلام کی جڑیں معاشرے میں گہری اور مضبوط رہیں۔ اور مسلم اقوام کے افراد اور عوام سے اس کا پختہ تعلق قائم رہا۔

اگرچہ احیائے اسلام کے بچے کھچے جذبات اور اس کے زندہ افکار نے استعماری طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے زوردار حرکت پیدا کی اور امّت کی مضبوط تائید سے انقلابی تحریکیں اٹھائیں جیسا کہ امیر عبدالقادر الجزائری، امیر محمد عبدالکریم خطابی اور سنوّسیوں نے لیبیا میں جنگ لڑی اور جمہوریہ داغستان میں سعید شامل نے اور افغانستان اور ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف انقلابی اقدامات کیے نیز شام، مصر، فلسطین اور عمان وغیرہ میں بھی ایسے ہی معرکے بپا ہوئے تاہم ان کارروائیوں سے فکری و اقتصادی یلغار کا مقابلہ نہ کیا جا سکا۔ اس لیے کہ خود مسلمانوں کے اسلامی احساسات پسپائی اور کمزوری کی وجہ سے اس یلغار کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ نیز ان میں فکر و عمل کی زندگی مفقود تھی۔ اور گذشتہ بلند تہذیبی سطح بھی انحطاط پذیر تھی۔ چنانچہ مشرقی اسلامی ممالک نے دشمن کے اسلحہ سے مدد مانگی ــــ باوجودیکہ اس کا نتیجہ خیر و شر میں سے کوئی ایک ہی ہو سکتا تھا۔ اور عزت و رسوائی میں سے صرف ایک ہی صورت ممکن تھی ــ کیونکہ

اِس میں اِن ملکوں نے بزعمِ خود ایک طاقتور کی سی صلاحیت و استعداد پائی اور اِن کے دلوں میں دشمن کو عظیم سمجھ لینے کے بعد اُس کے اسلحہ کی عظمت کا نقش بھی ثبت ہو گیا۔ غرض یہ ممالک ہر اُس چیز کو قوت طاقت کا سر چشمہ اور مجد و بزرگی کا باعث سمجھ لیتے جو ان کے دشمن کی طرف سے آتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ عام طور پر ملتی جلتی اور لازم و ملزوم اشیاء کے بارے میں ایک ہی حکم لگا لیا کرتے ہیں چاہے ان کی حقیقت مختلف ہی ہو۔ اور یہی نفس و طبیعت کا قاعدہ ہے جسے "قانونِ تداعی الافکار" بھی کہتے ہیں۔ پس اِس طرح اُس فکری نفوذ اور یلغار کا انمام ہوا جو استعماری طاقتوں کی فوجی کارروائیوں کے زوال کے بعد بھی سرگرمِ کار رہی، کیونکہ اس فکری جنگ کو خود مسلمان ملکوں سے ایسے علمبردار مل گئے تھے جو اسے سہارا دینے والے ستون ثابت ہوئے۔

اور اسلام اس عرصہ میں سربلند اور سرگرم ہونے کی کوشش کرتا رہا لیکن خود اسلام، فرزندانِ اسلام اور علمبردارانِ اسلام کا فرض ہے کہ وہ دو کام ضرور کریں۔ پہلا کام یہ ہے کہ انحطاط و تنزل اور پسماندگی کے دور میں اسلام میں جو آمیزشیں ہو چکی ہیں اور اس کی صورت کو بگاڑ کر رکھ دیا گیا ہے اُن سے اسلام کے دامن کو پاک کریں۔ اور دوسرا کام یہ ہے کہ مغرب کا اجتماعی نظم اس کے فلسفوں اور افکار و نظریات کا چیلنج جرأت سے قبول کریں۔ اور یہ دونوں آپریشن بیک وقت ہونے چاہییں۔ اس طرح کہ اسلام پر جو پردے پڑے ہوتے ہیں اور جو غلط باتیں اس کی طرف منسوب کی گئی ہیں ان کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ نیز اس کے مقاصد کی درستی اور ان کی اور دوسرے معیارات کی نسبت اصل اسلام کی طرف دوبارہ کی جائے۔ اور اسلام کے جن امور سے غفلت برتی گئی ہے انہیں منصۂ شہود پر لایا جائے۔ یہ آپریشن بہت مشقت طلب اور طویل ہوگا۔ کیونکہ یہ اس عقل و ذہنیت کی مکمل تبدیلی چاہتا ہے جو صدیوں میں پروان چڑھی اور ان جذبات و داعیات کو بھی بدل دینا چاہتا ہے جنہیں ایک لمبے عرصے میں نشو و نما ملی۔ اور جب تک ضرورت محسوس ہو اس آپریشن کو جاری رہنا چاہیے۔ جہاں تک دوسرے آپریشن کا تعلق ہے تو اس کی ابتدا کے طور پر تہذیبِ مغرب کے افکار و نظریات اور اس کے نظمِ اجتماعی سے مماثل افکارِ اسلام کا ان سے موازنہ و مقابلہ کیا جائے اور اس سلسلہ میں خوب بحث و تمحیص ہو۔ یوں معاشرہ مرحلۂ اوّل سے گزر جائے گا جس میں اسلام اور افکارِ مغرب میں موافقت پیدا کرنے کا کام ہوگا۔ اس مرحلہ میں کبھی افکارِ مغرب کو لباسِ اسلام پہنایا جائے گا تاکہ ان کی اسلامی معاشرہ تک رسائی بسہولت ہو سکے[1] اور کبھی خود اسلام کو افکارِ مغرب کے قالب میں ڈھالا

---

[1] ان دونوں کاموں میں فرق کرنا خاصا بڑا مسئلہ ہے۔ اور یہ کافی پیچیدہ بھی ہے اس حیثیت سے کہ مذکورہ کام

(باقی ص ۲۹ پر)

جائے گا تاکہ ان اصحابِ عقل و خرد کے لیے آسانی رہے جو فکرِ مغرب سے مانوس ہیں اور جنہوں نے اسالیبِ مغرب اپنائے ہیں تاکہ اس فکر کو گوارا اور مقبول بنا سکیں۔ تو اس طرح یہ مرحلہ ایک پُل ثابت ہوگا جو اسلام اور فکرِ مغرب کو ملا دے گا۔ اس مرحلہ میں اصل اور جعل اور کھرا کھوٹا ملا جُلا نظر آئے گا۔

اس مرحلہ کے فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ اس سے عظمتِ اسلام کے بہت سے گوشے بے نقاب ہو جائیں گے اور اس کے احکام کی حکمت واضح ہو جائے گی۔ اُسی طرح جس طرح کبھی کبھی تحقیقِ افکار کے نام سے اسلام کے صریح احکام کی تاویل میں راہِ حق سے انحراف کیا جاتا تھا۔ اسے افکارِ غیر کا لبادہ پہنایا جاتا اور نئے نئے اور اجنبی خیالات اس پر ٹھونسے جاتے تھے۔ پس ناگزیر ہے کہ اس مرحلہ کے بعد ایک تیسرا مرحلہ بھی آئے جس میں دونوں مختلف فکروں، عقیدوں اور نظاموں کا اختلاط بالکل ختم کر دیا جائے اور ساتھ ہی اُس سطح بلند کا تحفظ بھی کیا جائے جس تک احیائے اسلام کی تحریکِ جدید پہنچ چکی ہے۔ یہی آخری مرحلہ اصل اسلام کا پتہ دے گا اور اس کی حقیقت اور اس کے امتیازی خصائص بھی اسی میں ظاہر ہوں گے۔
اس وجہ سے اور اُس تجربہ کی بنا پر جس سے تحریکِ بیداری گزر چکی ہے یہ مرحلہ اُس گہرائی کا حامل ہوگا جو عینِ اسلام کا سراغ لگانے والی بحث کے دوران اس میں پیدا ہو چکی ہے۔ وہ بحث کہ جس کا تقاضا، فکرِ مغرب اور اس کی خصوصیات کی معرفت تھی۔ اسی طرح فکرِ اسلامی اور اس کے امتیازی اوصاف کی معرفت بھی نیز ان دونوں میں جو خفی اور جلی فرق ہیں ان کا شعور بھی۔

لیکن فکرِ اسلامی کا جہاں یہ فرض تھا کہ دونوں کام سرانجام دیتا یعنی ایک تو زمانہ ہائے اختلاط کے دوران اسلام کے رُوئے زیبا کو جس طرح مسخ کر کے پیش کیا گیا اس کا پوری طرح ازالہ کرنا، دوسرے فکرِ مغرب کا جرأت سے مقابلہ کرنا ـــــ چاہے اس کے ساتھ موافقت پیدا کر کے یا اس کی بھرپور مخالفت کر کے ـــــ

(بقیہ حاشیہ ص۲۸) کرنے والوں پر کوئی حکم لگایا جائے۔ کیونکہ پہلا کام کرنے والے عملاً یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو فکرِ مغرب کی طرف دھکیلا جائے اور اس کام میں مغرب کے بعض سیاستدانوں اور دانشوروں نے ان کی بڑی مدد کی ہے جبکہ دوسرا گروہ جو اسلام کے لیے جذبۂ اخلاص رکھتا ہے اور اس کی نشر و اشاعت کا خواہاں ہے یہ کوشش کرتا ہے کہ پیغامِ اسلام کو ذہنوں کے قریب کر دیا جائے۔ ان کے اس کام میں خطاء و صواب کا جو امکان ہے اس سے صرفِ نظر کر کے ہی معاملہ کو نپٹایا جا سکتا ہے۔ (مصنف)

اور اپنے مجموعی ڈھانچہ پر نظرِ عمیق ڈالنا تاکہ حیاتِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جاتا، وہاں اسی وقت اس کا یہ فرض بھی تھا کہ اسلامی معاشرے کی اس اندرونی کشمکش میں شریک ہوتا جو فکرِ مغرب کی پیدا کردہ تحریکوں نے برپا کر رکھی تھی۔ ایسی تحریکیں جو اسلام سے نہ صرف یہ کہ ناواقف تھیں بلکہ اس کی بگڑی ہوئی صورت اٹھاتے پھرتی تھیں حالانکہ وہ خود بھی فکرِ مغرب سے جنم لینے والے مختلف رجحانات[1] کی حامل تھیں۔

---

[1] ان مختلف رجحانات میں سے ایک تو نظریۂ وطنیت ہے جس کی بنیاد فلسفۂ انفرادیت (INDVIDUALISM) پر ہے۔ اس میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک معاملہ خود اسی فرد پر ہی چھوڑ دیا جاتا ہے جس سے وہ متعلق ہو۔ لہٰذا اس نظریہ کے تحت حکومت کا فرض ہے کہ وہ فرد کے معاملے میں مداخلت نہ کرے۔ نہ اس کی تائید و حمایت کرے اور نہ اس سے نبرد آزما ہو۔ یہی نقطۂ نظر علمانیہ تحریک کا بھی ہے جو مذہب اور حکومت میں مکمل علیحدگی کی قائل ہے۔

اور تصورِ قومیت سے مراد اگر محض سیاسی فکر ہو تو یہ تصورِ وطنیت سے کافی حد تک ملتا جلتا ہے لیکن اگر قومیت کو بحیثیت ایک عقیدہ اور نظریہ کے سمجھا جائے تو یہ اسلام میں عربی قومیت کے مراحل میں سے ایک مرحلہ سمجھا جائیگا اور قومیت کے مختلف رجحانات میں کسی درجہ میں اسے وراثتِ علمی اور قوم کے ماضی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اس اعتبار سے تو اس کی جتنی چاہو مدح و توصیف کر لو بشرطیکہ اس کی مرحلہ وار تاریخی قدر و قیمت سے تجاوز نہ کرو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تصوراتِ قومیت کا ظاہر اگرچہ عربوں کے لغت و ادب اور دوسرے خصائص کا تعصب ہے مگر ان کا باطن قومیتِ عرب کی جڑوں کو کھود ڈالنے والا ہے۔ چاہے ان افکار کے شارحین و مبلغین، شعور و ہوش رکھنے والے پکے قوم پرست ہوں یا اس اجنبی فلسفہ کی مخصوص ثقافت کے اثرات سے فریب خوردہ حضرات۔ اور اس تصورِ قومیت کے علمبردار ساطع الحصری، علی ناصر الدین اور میشیل عفلق ہیں۔

رہا مارکسی اشتراکیت کا تصور، تو اس کا رجحان اس کے اصل سرچشموں سے بغیر کسی اشتباہ کے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ مارکس کی نظر میں دین قوموں کے لیے ایک افیون کی حیثیت رکھتا ہے، اسی لیے لینن کے قول کے مطابق دین و مذہب سے جنگ و جدل ضروری ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر مذہب کی الف باد مادہ سے شروع ہوتی ہے۔ نتیجۃً ہر مذہب کا مبدأ آغاز مارکسیت ہے لیکن یہ اس حد تک ہی نہیں رہتی (بلکہ آگے تک جاتی ہے، مترجم) لینن نے یہ بھی کہا ہے کہ ہمارے پراپیگنڈہ کا الحاد کی نشر و اشاعت پر مشتمل ہونا ناگزیر ہے۔ وہ مزید کہتا ہے: "ہر اشتراکی کے لیے واجب ہے کہ وہ مادہ پرست ہو، یعنی دین کا دشمن۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ جدلی مادیت پر ایمان رکھنے

(باقی صلا۳ پر)

لاریب وہ اہم ترین کام جس پر ہماری مشکلات کا حل اور ہماری فکری اجتماعی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں سامنے کھڑے بحرانوں سے بچ نکلنا موقوف ہے اور وہ سنگین ترین مسئلہ جس پر ہمارا وجود ہماری ترقی اور ہماری نجات موقوف ہے، یہ ہے کہ مرحلہ التلفیق[1] والتبعیہ میں تطہیر کا کام جلد از جلد شروع کر دیا جائے اور مسلم اقوام کے عامۃ الناس میں مرحلہ الذاتیہ[2] کے دوران پیدا ہونے والا شعور عام کیا جائے۔ ساتھ ہی خواص کے درمیانہ طبقہ میں اس شعور کو پختہ اور گہرا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی جائے۔ جب یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا تو فکر و اعتقاد، سیاست و اجتماعیت، اقتصاد اور فنون کے شعبوں کی ساری عمارت ہی منہدم ہو جائے گی جس میں مغرب کی تقلید اور پیروی کا وصف پایا جاتا ہے۔ اس اندھی تقلید کے بُت منہ کے بل گر پڑیں گے اور اس کی علامات اور مظاہر عامۃ الناس کے شعور کے سامنے بے قدر ہو کے رہ جائیں گے جو حقیقتِ اسلام کو سمجھ کر نئے حالات میں اس کے فرمانبردار بن چکے ہوں گے۔ اس طرح وہ سب مشکلات حل ہو جائیں گی جو لاعلاج نظر آتی ہیں۔ اور وہ بحران بھی جو لوگوں کو دور ہوتے نظر نہیں آتے، ختم ہو جائیں گے۔ جس دن یہ کام ہو جائے گا۔ اُس دن عرب قوم اپنی گم کردہ وحدت دوبارہ پالے گی۔ چاہے اس کے حکمران راضی ہوں یا ناراض۔ اور اس کے ساتھ ہی اسلام پر مکمل ایمان رکھنے والی وہ تمام قومیں بھی دونوں عالمی فوجی کیمپوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوں گی جو اس کے قریب

(تعبیہ حاشیہ منہ۳) والا ہو یعنی دین کے خلاف عملاً کشمکش برپا کرنا اس کا اوّلین ہدف ہونا چاہیے محض نظری طور پر کشمکش کا قائل ہونا کافی نہیں۔ اور یہ لڑائی طبقاتی کشمکش کی بنیاد پر لڑی جانی چاہیے" بحوالہ البرولیتاریہ شمارہ ۴۵ مطابق ۱۴ مئی ۱۹۰۹ء اور الحیاۃ الجدیدہ شمارہ ۲۸ مطابق ۳ نومبر ۱۹۰۵ء۔ اور اشتراکیت میں خود دین کا مفہوم یہ متعین کیا جاتا ہے کہ یہ مادہ و طبیعت کے مقابلے میں انسان کے اوّلین عجز کا مظہر ہے۔ اور اس کے زعم میں دین، علم کا نقیض ہے اور ایک ایسا فلسفہ ہے جسے بورژوا طبقہ کا مفاد پیشِ نظر رکھتے ہوئے وضع کیا گیا ہے۔

بلاشبہ ان تینوں مختلف تصورات کو اسلام سے جہالت اور اسکی سطحی اور ناقص واقفیت نے عمر بخشی ہے نیز اس لیے کہ اسلام کو بھی دوسرے ادیان و مذاہب پر قیاس کر لیا گیا اور مسلمان مذکورہ فاسد نظریات اور فلسفوں کے آگے بچھ گئے۔ نیز انہی کے چوکھٹے میں اپنے آپ کو تنگ دلی اور تعصب کے ساتھ محبوس کر لیا۔ اور ان کے علاوہ دوسرے تمام افکار سے نظریں بند کر لیں (مصنف)

[1] اس سے مراد جیسا کہ مصنف ذکر کر چکے ہیں اسلام میں آمیزش اور فاسد افکار و نظریات کی پیروی کا مرحلہ ہے (مترجم) [2] یہ عین اسلام ہے اور حقیقتِ دین کے فہم کا مرحلہ ہے (مترجم)

جوار میں رہتی ہیں۔ ان فوجی کیمپوں سے مراد ایک تو مغرب کا جمہوری بلاک ہے اور دوسرا اشتراکی۔ اور ان دونوں کے مادہ پرستانہ تہذیب و تمدن کے مقابلے میں صف آراء ہو جائیں گی جو برابر کے شریکوں کی طرح اسلامی تہذیب و تمدن کو چیلنج کرنے میں مشترک ہیں۔ تاہم جدید عالم اسلامی تیسرا فوجی کیمپ کبھی نہیں بنے گا۔ کیونکہ وہ رشتہ اور باہم متحارب فوجی کیمپوں میں بے ایمان نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس عالم اسلامی انسانی تہذیب کا ایک ایسا مقام بلند بن کر اُبھرے گا جو پوری انسانیت کا منتظر ہوگا اور اس کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے گا۔ اور فنی آلات کی قوت اور مادی تہذیب کے دوسرے تمام ثمرات اس انسانی تہذیب کے خادم قرار پائیں گے نہ کہ اس کی شان و شوکت بڑھانے والے۔

ضروری ہے کہ اسلام کی وہ جعلی اور مسخ شدہ صورت آخر کار ذہنوں سے زائل ہو جسے غلط افکار کی پیروی، دوسروں پر بھروسہ اور حق و صداقت کے انکار نے اور بھی سیاہ کر دیا ہے اور وہ صورت بھی ذہنوں سے کھرچی جانی چاہیے جسے بعض اصحاب قلم اور سیاستدان اسلام کے نام سے پیش کرتے ہیں یا اسے عین اسلام ہی گمان کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ گذشتہ زمانہ ہائے انحطاط سے لے کر آج تک اس تصور فاسد کو بحیثیت اسلام پیش کرنا، اس کے خالق کو لباس بزرگی عطا کرنے والی بات ہے اگرچہ یہ عزت جہالت کے رسوا کن عیب کی بدولت ہی ملے گی۔ یا پھر یہ چیز اسلام کے خلاف اس کے پوشیدہ کینے کو ظاہر کرتی ہے۔ بہر حال اس کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ اسلام کا نادان دوست ہے یا نہایت ہوشیار اور کینہ توز دشمن۔

حاملین فکر اسلامی کی سب سے پہلی مہم جو ہماری زندگی کے اس عرصہ میں شروع ہوئی حقیقت اسلام کو بے نقاب کرنے اور اسلامی معاشرے کو ایک طرف ذہنی غلامی اور دوسری طرف اختلاط افکار سے آزاد کرانے سے متعلق تھی۔ جس سے اس مرحلہ کی تطہیر کا مطلوبہ مقصد پورا ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو اسی تجربہ سے دوچار پایا اور غالباً وہ انہی مراحل سے گزرے۔ اور قائدین فکر اسلامی کے پیش رو جنہوں نے تاریخی حالات کے مطابق گذشتہ نسل میں فکر مغرب کے ساتھ موافقت پیدا کرنے کو اہمیت دی، ان کے لیے راستہ ہموار کر دیا تاکہ بعد والے نئے مرحلہ میں داخل ہو جائیں جو سلبی طور پر اندھی پیروی اور اختلاط افکار سے نجات اور ایجابی طور پر حقیقت اسلام کے اثبات کا مرحلہ ہے۔ آخری زمانے میں فکر اسلامی کے حاملین نے اپنے اسلاف کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ جیسے علامہ

جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، فرید وجدی، امیر شکیب ارسلان اور عبدالعزیز شاویش وغیرہ تو یہ تلامذہ ان کی ہو بہو تصویر نہیں بن گئے بلکہ ان کے شروع کردہ کام کی تکمیل میں لگ گئے۔ اور اس منزل سے بھی آگے گزر گئے جس تک ان کے اکابر پہنچے تھے بلکہ وقتاً فوقتاً ان کے مقصود کی صحت و درستی بھی کرتے رہے۔ اب یہ تاریخ کا فرض ہے کہ اُن پیشروؤں کے کام کی حقیقی قدر و قیمت واضح کرے کہ انہیں اپنی منزل تک پہنچنے کی کس حد تک توفیق ملی؟ کہاں تک وہ حصولِ مقصد میں مخلص اور اس کے لیے صراطِ مستقیم پر گامزن رہے؟ تاریخ اس حقیقت کی وضاحت کرے گی جس طرح متاخرین کے بارے میں اپنا فیصلہ دیگی۔

یہ مباحث جو قاری کو اس کتابچہ میں ملیں گے اُسی فکر کو مربوط اور منظم کرتے ہیں جس کا میں نے اس مقدمہ میں اظہار کیا ہے۔ یعنی وہ فکر جو عین اسلام سے عبارت ہے جس کی تطبیق کے محل مختلف مسائل و موضوعات میں اختلاف کی گنجائش رکھ سکتے ہیں۔ اور یہ موضوعات میرے ان اقدامات سے تعلق رکھتے ہیں جو میں نے کیے ہیں اور ان فکری تجربات سے متعلق ہیں جنہیں دسیوں سالوں کے دوران میں نے ملاحظہ کیا اور جنہوں نے مجھے ان رجحانات تک پہنچایا۔ تو میرے مقدر میں تھا کہ اپنا بچپن شہر دمشق کے محفوظ اسلامی معاشرہ کی فضاؤں میں گزاروں اور یہ کہ نوعمری کے زمانہ میں ہی بیک وقت دونوں ثقافتوں سے متمتع ہو سکوں۔ ایک ثقافت نوئی اور عہدِ رواں کی ثقافت تھی جو ابتدائی اور ثانوی سرکاری مدارس[1] میں موجود تھی۔ اور یہ ثقافت اس زمانے میں فرانسیسی طریقِ تعلیم سے ماخوذ تھی اگرچہ عربی رنگ اس پر غالب تھا۔ اور علمائے کرام کے حلقوں میں دوسری ثقافت سے فیضیاب ہونا بھی میری قسمت میں تھا۔ اس طور پر کہ علمائے شام کے شیخ محمد بدرالدین الحسنی[2] جو محدث اکبر کے لقب

---

[1] اور یہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۲ء تک کے درمیانی عرصہ کی بات ہے۔ (مصنف)

[2] ان کی وفات (اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے) ۱۹۳۵ء کے موسمِ گرما میں ہوئی۔ آپ کا علم ثقافتِ اسلامیہ کے جملہ شعبوں پر حاوی تھا، یہاں تک کہ آپ اس سے تعلق رکھنے والے مادی علوم پر بھی عبور رکھتے تھے لیکن آپکو خصوصی شہرت علمِ حدیث کی بنا پر حاصل تھی۔ آپ کثیر العبادت بہت کم آمیز، نہایت کم گو اور صرف علم و عبادت ہی میں مشغول رہنے والے بزرگ تھے البتہ فرانسیسیوں کے عہد میں سامراجی نوآبادکاروں کے خلاف جہاد کے لیے بہت ترغیب دیتے تھے اس کا اپنے عمومی اسباق میں بھی چرچا کرتے اور شام کے بعض انقلابی قائدین سے بھی اُن کے روابط تھے۔ حکام اور عام لوگوں کے دلوں میں ان کی بہت ہیبت تھی (ان کے مکمل تعارف کے لیے عربی مجلہ حضارۃ الاسلام دیکھیے)

سے مشہور تھے، کی صحبت میں چند سال گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی تو میں نے ان سے ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۴ء تک کے درمیانی عرصہ میں کتبِ ثقافتِ اسلامیہ کے بہت سے عام اور خاص اسباق پڑھے۔ جن کا تعلق مختلف علوم جیسے تفسیر، حدیث، اصولِ فقہ، وراثت، نحو، منطق، تصوف، حساب، الجبرا، ہندسہ اور فلکیات سے تھا۔ اور یہ آخرالذکر علوم بھی اپنے قدیم مصادر و مآخذ کے لحاظ سے عربی ہی ہیں۔

میرے لیے طے تھا کہ اپنے والد[۱] سے ابتدائی تعلیم حاصل کروں۔ آپ ملک شام میں فاضل ترین شیخِ ادب تھے جو گوناگوں مذاکراتِ علمی کے پہلو بہ پہلو، شرح المعلقات، لامیۃ العرب، المقصورۃ الدریدیہ اور مقاماتِ حریری جیسی کتبِ ادب پڑھانے میں خصوصی شہرت رکھتے تھے۔ بعد ازاں میں نے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک شام کی یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کی۔ پھر مجھے اس بات کی توفیق ملی کہ اپنے ذاتی مطالعہ کو وسعت دوں، یعنی فقہ اور خاص طور پر مذہبِ حنفی اور مذہب مالکی کا مطالعہ کروں۔ اس کے بعد مجھے پیرس یونیورسٹی میں ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء تک لٹریچر اور سوشیالوجی پڑھانے کا موقع ملا۔ اس زمانۂ تدریس نے مغربی ثقافت کے دور دراز گوشوں تک مجھے رسائی بخشی جس سے میں بہت کچھ واقف بھی تھا، تاہم مزید واقفیت کے لیے اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ ان مشاغل کے ساتھ ساتھ میں پیرس کی مختلف علمی و سیاسی مجالس میں بھی حاضر ہوتا۔ ان مجالس میں جہاں پیرس کے بشپ اور اس شہر کے مشہور خطیب کرڈینال فردیہ کے افکار سے واقف ہوا وہاں کمیونسٹ لیڈر موریس توریز کے خیالات بھی سنے۔ معروف شاعر پول فالیری اور عظیم ادیب اندرا موروا کی طرف بھی متوجہ ہوا۔ میں نے جہاں مولیر دراسین کی کہانیوں کا المسرح[۲] الکلاسیکی میں مشاہدہ کیا وہاں المسرح[۳] الشعبی میں مکسیم گورکی کی کہانی "ماں" کی فلم بھی دیکھی۔ اور

۱؎ آپ کا اسم گرامی عبدالقادر بن محمد المبارک الجزائری الحسنی تھا۔ آپ نے ۱۹۴۵ء میں وفات پائی۔ مرحوم اوّل درجہ کے لغت دان اور زبان عربی میں خصوصی ملکہ رکھنے والے تھے۔ آپ قدیم لٹریچر اور خاص طور پر اشعارِ جاہلیت کے بہت بڑے راوی اور لغت کے مشکل اسالیب جاننے کے بے حد شوقین تھے۔ نیز تراجمِ رجال پر بالعموم اور صحابہ کرام اور اصحاب سیرت کے تراجم پر بالخصوص وسیع اطلاع رکھتے تھے۔ (ان کے مکمل تعارف کے لیے دیکھیے۔ استاذ ظافر القاسمی کے مکتب عنبر کی کتاب جسے المکتبۃ الشرقیہ بیروت نے شائع کیا ہے یا المجمع العلمی العربی دمشق کا مجلہ ۱۹۴۶ء)۔ (مصنف)

۲؎ و ۳؎ یہ دونوں نام عربی تھیٹروں کے ہیں۔ (مترجم)

جس طرح الجزائریوں کی تحریک جمعیۃ العلماء المسلمین، ان کے بعض اکابر اور عام اُجرت پیشہ حضرات جوان کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے، سب کا قریب سے مطالعہ کیا، اُسی طرح پیرس میں امیر شکیب رحمۃ اللہ علیہ سے جان پہچان کی ان سے اُٹھنا بیٹھنا رکھا اور ان کی باتیں سُنیں۔ الجزائریوں کا قریب سے مطالعہ کر کے میں نے خود الجزائر کے بارے میں نیز اس کی تحریکات اور رجال سے متعلق اپنی معلومات میں بہت کچھ اضافہ کیا کیونکہ میں اس کے حالات جاننے کا بہت خواہشمند تھا۔ میں پیرس سے ۱۹۳۸ء کے اواخر میں واپس لوٹا جب دوسری عالمگیر جنگ کی بدولت نئے نئے واقعات رُونما ہو رہے تھے۔ اور پھر پانچ سال میں نے وزارتِ تعلیم کے تحت تدریس میں گزارے اور مزید دو سال خصوصی معائنہ کا منصب رکھ کر وزارتِ تعلیم کے کمیشن کا رکن رہ کر بسر کیے جو اس وقت وزارتِ تعلیم کا بلند ترین فنی کمیشن تھا اور اسی نے مجھے اُس وقت مدارسِ ثانویہ[1] میں لغتِ عرب اور دینیات کی تدریس کا نصاب وضع کرنے کے کام پر مامور کیا تو میں نے ادب و دین دونوں کا سابقہ بنیادوں سے کافی مختلف نصاب وضع کر دیا۔ اور میرے وضع کردہ نصابات پر اس مدت کے دوران معمولی تغیّر و تبدّل کے ساتھ عمل ہوتا رہا۔

پھر میں ایک دوسرے میدان یعنی میدانِ سیاست میں داخل ہوا اور اس میں اپنی زندگی کے گیارہ سال (۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک) گزارے۔ اس عرصہ میں مجھے دمشق کے ایک منتخب نمائندہ کی حیثیت سے پے در پے تین بار پارلیمان میں پہنچنے کا موقع ملا۔ ان میں سے پارلیمان کے ایک تاسیسی اجلاس میں ملک کا دستور وضع کیا گیا جسے ۵۱ء کا دستور کہا جاتا ہے۔ اِس دوران میں میں وزارت میں شریک ہو گیا اور ۵۰ء میں امورِ عامہ اور مواصلات کا وزیر مقرر ہوا۔ پھر ۱۵ء مجھے وزیر زراعت بنایا گیا۔ اس میدان میں مجھے اندازہ ہوا کہ معاشرہ کو درپیش مشکلات کے پہاڑ کیا ہوتے ہیں۔ نیز مختلف تنظیموں جماعتوں اور تاریخ کے دھاروں کو سمجھنے کا موقع ملا۔

اس درمیانی مدت میں ایک لیکچرر کی حیثیت سے میں نے یونیورسٹی کے کلیتہ الآداب میں تعلیم لغت اور اسباقِ قرآن کی تدریس کا شغل بھی جاری رکھا۔ ازاں بعد ۱۹۵۵ء میں لا کالج میں میرا تقرر ہوا۔ پھر میں نے

---

[1] اور یہ کام ۱۹۴۵ء میں غیر ملکی فوجوں کے انخلاء اور قومی حکومت کی تشکیل کے بعد ہوا۔ اور قومی حکومت نے مکمل آزادی کے بعد تعلیم کے فنی ساز و سامان میں اور نصابات اور طریقہ ہائے کار میں بعض بنیادی تبدیلیاں کیں۔ (مصنّف)

سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی اور مکمل طور پر یونیورسٹی کے فکری و علمی کام میں لگ گیا۔ سیاست سے میری علیحدگی کے اسباب بہت ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں تاہم ان میں سے سب سے بڑا سبب شام میں سیاسی انقلابات کا بکثرت اور اچانک آنا ہے۔ مزید یہ کہ میں اسلامی شعور پیدا کرنے کی ضرورت کو، سیاسی کام پر فوقیت دینے کا احساس رکھنے لگا تھا تاکہ بوقت ضرورت اس کا سہارا لیا جا سکے اور اس سے مدد طلب کی جا سکے۔

یونیورسٹی کے علمی و فکری میدان میں، جامعہ کے لیے اسلامی تعلیمات کا نصابی خاکہ تیار کرنا میرے ذمہ لگایا گیا۔ چنانچہ جامعہ دمشق کے لا کالج کے لیے ایک خاکہ تیار کرنے کے کام میں شریک ہو گیا۔ پھر ایسی ہی منصوبہ بندی ازہر شریف کے لیے کرنا پڑی کیونکہ متحدہ عرب جمہوریہ کی کابینہ کے سربراہ نے مجھے ذاتی طور پر اس کام کی تکلیف دی تھی۔ لہٰذا میں نے درجہ بندی کی بنیادوں کے بارے میں ایک رپورٹ پیش کی پھر ۶۰ء میں قانون پاس ہو جانے کے بعد، جامعہ ازہر کے کالجوں کا طریق کار اور نصابات طے کرنے کے کام میں لگ گیا۔ بعد ازاں مدینہ منورہ کی اسلامی یونیورسٹی کی اعلیٰ مجلس مشاورت کے ایک رکن کی حیثیت سے اس کا نظام، طریقہ ہائے کار، مقاصد اور نصابات وضع کرنے کے کام میں شرکت کی پھر مکہ کے لا کالج میں اور آخراً سوڈان کی ام درمان اسلامی یونیورسٹی میں ایسا ہی کام کیا۔ جب طہران یونیورسٹی نے مجھے ایران کی سیاحت کے دوران بلایا تو اس سے مجھ پر ثقافتِ اسلامیہ کے مظاہر سے واقفیت کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ چنانچہ میں نے کلیۃ المعقول والمنقول کا معاینہ کیا جسے اب "کلیۃ الالاھیات والثقافۃ الاسلامیہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور ایرانی یونیورسٹی میں بعض ثقافتی پہلوؤں کا بھی جائزہ لیا۔

تو اس طرح مجھے متعدد عربی اسلامی ممالک میں ثقافتِ اسلامیہ کے مختلف دوائر سے ربط رکھنے اور ان کے بارے میں بحث و تمحیص کرنے کا مسلسل موقع ملتا رہا۔

اپنا یہ تجربہ جو میں نے اختصار کے ساتھ قاری کے سامنے رکھا ہے اسے پیش کرنے کا مطلب اُسی ربط و تعلق کو بیان کرنا ہے جو اِس کے اور آئندہ پیش کیے جانے والے میرے افکار کے درمیان رہا ہے تو بات یہ ہے کہ میرے افکار کوئی کچے اور کمزور خیالات نہیں جو بند پڑے ہوئے کسی کمرے کی کتابوں اور اوراق میں پیدا ہو گئے ہوں بلکہ یہ وہ افکار ہیں جو اپنے زندہ ماحول کی پیداوار ہیں۔ یہ میری زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنے۔ میرے عقل و دل پہ چھا گئے اور تجربات کے متعدد دریچوں سے گذر کر مجھ تک پہنچے۔ وہ دریچے

کہ جن سے خود زندگی، معاشرہ اور کائنات مجھے جھانکتی رہی۔ اور میں یہ مباحث اقوامِ اسلام کے فرزندوں میں سے عام اربابِ ثقافت کے آگے پیش کر رہا ہوں اور ان میں عربی قوم سب سے مقدم ہے۔ شاید ان مباحث میں اسے کوئی ایسی شے ملے جو بزور وقوت عربی قوم کو نئے مرحلہ کی طرف دھکیل دے جو ہمارے سامنے ہے۔ اور یہ بات اس امید پہ کہی جا رہی ہے کہ پرانے قائدینِ فکر و سیاست ـــــ جو دورِ تقلید کی نمائندگی کرتے ہیں اور جو اس دور کی ابتدائی نہیں بلکہ آخری نشانی ہیں ـــــ کے جانشین نئی نسل کے وہ قائد ہوں گے جو آنے والے مرحلہ میں صحیح نمائندگی کر سکیں۔ وہ مرحلہ جسے ذہنی غلامی سے نجات اور حقیقتِ اسلام کے اثبات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ جانشینی ایسی ہی ہے جیسے پرانے قائد اپنے سے پہلی نسل کے قائم مقام بنے جو ہر خیر و شر کی حفاظت کرنا ضروری سمجھتی تھی۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ افکارِ مغرب کی تقلید کا زمانہ اپنی آب و تاب کھو دے۔ اُس کے مظاہر مٹ جائیں۔ اور اس کے فتنہ و فکر و فریب کا خاتمہ ہو جائے۔ ویسے اب اس کی چمک دمک اس کے اصل پیروؤں کے نزدیک بھی زائل ہو رہی ہے اور بلادِ یورپ جو ان افکار کے سرچشمے ہیں وہاں بھی ان کی روشنی گُل ہونے کو ہے۔ تاہم اس کی ایک جھلک ہمارے معاشرے میں دیر تک موجود رہے گی، اُس ستارے کی طرح جو بے نور ہو چکا ہو لیکن اس کی روشنی ـــــ جسے زمین تک پہنچنے کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے ـــــ مسلسل چلتی رہتی ہے حالانکہ اس کے پیچھے کوئی چمکدار شے نہیں ہوتی کَسَرابٍ بقیعۃٍ یحسبہ الظمآنُ ماءً حتی اذا جاءہٗ لم یجدہٗ شیئاً۔ سورۃ نور آیت ۳۹۔ جیسے دشتِ بے آب میں سراب کہ پیاسا اُسے پانی سمجھے ہوئے تھا مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا۔

بلاشبہ ہمارا اُن جنگوں میں غلبہ پانا ـــــ جو دنیا بھر میں صہیونیت کے علمبردار یہودیوں، زر و زمین کے بھوکے توسیع پسندوں اور غلط افکار و نظریات مسلّط کرنے والوں کے خلاف ہم کر رہے ہیں۔ جو اپنے اپنے نظریات میں اختلاف رکھنے کے باوجود، کفر و باطل پہ اتفاق اور صرف مادہ و منفعت پر ہی ایمان رکھتے ہیں۔ ہمارا فتح یاب اور غالب رہنا ـــــ فلسطین اور کشمیر کی وادیوں میں، عمان، سومالی لینڈ، اریٹریا اور زنجبار کے علاقوں میں اور بخارا، تاشقند، چین اور دوسرے بہت سے میدانوں میں ـــــ کہ جن میں سے ہر ایک پہ اسلام سایہ فگن رہا ہے مگر بعد میں حملہ آور ان بلادِ اسلامیہ پہ چڑھ دوڑے اور دوسروں کے ہاتھ میں حکومت آگئی۔ اسلام جو حاکم تھا محکوم بن گیا اور اہلِ اسلام حکمرانی کے بعد غیروں کی پیروی کرنے

لگے ۔ اسی طرح مظالم و مفاسد اور کمزوری و پسماندگی پہ قابو پانے کے لیے ہمارا اندرونی آویزشوں میں غالب رہنا ——— موقوف ہے غیروں کی فکری و سیاسی غلامی سے ہمارے آزاد ہونے پر اور اپنی بلند و برتر بنیاد پہ متحد ہونے پر کہ جہاں اعلیٰ مثالیں اور عظیم اصول مل بیٹھتے رہے ۔ اور جہاں انسان کسی کا غلام بن کر نہیں تھا ۔ نہ بڑے لوگوں کا نہ لیڈروں کا نہ عوام کا نہ حکومتوں کا اور نہ کسی ایسے شخص کا جو اپنے بارے میں یہ گمان رکھتا ہو کہ وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کا نائب ہے ۔ اور جس بنیاد کے لیے فنی میدان میں نظم اور باقاعدگی، صنعتی بنانے کی نئی پالیسی اور مادی ساز و سامان کی عمومی تیاری ایسے اسبابِ قوت میں سے ہے کہ جن کے بغیر چارہ نہیں ۔ اور یہ سب کچھ اس مقصود کی خدمت اور اس کے اثبات کے لیے ہے ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سیدھی راہ پہ چلائے ۔ اور بہترین مقاصد تک پہنچنے کی توفیق عطا فرمائے ۔ اور انہی بہترین مقاصد پر ہمیں متحد رکھے تاکہ ہم اپنے لیے بھی خیر و سعادت کا استحقاق پیدا کر سکیں اور پوری انسانیت کے لیے بھی ۔

ایجنٹ صاحبان متوجہ ہوں

"آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس" نے انگریزی دو ماہی مجلہ "اسلامک ایجوکیشن" کے ساتھ ساتھ اب یکم جنوری سے اردو میں بھی ایک دو ماہی مجلہ "اسلامی تعلیم" کے نام سے شائع کرنا شروع کر دیا ہے ۔ ان دونوں جریدوں کی فروخت کے لیے اب ہم نے ہر شہر میں اپنا سیل ایجنٹ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے ۔ شرائط ایجنسی درج ذیل ہیں:

۱ ۔ بیس کاپیوں کے آرڈر تک ۲۵ فیصد کمیشن

۲ بیس سے زائد اور ڈیڑھ صد سے کم کاپیوں پر ۳۳⅓ فیصد کمیشن

۳ ۔ ڈیڑھ صد سے زائد پر ۴۰ فیصد کمیشن

۴ ۔ پرچوں کی ترسیل کا خرچہ ادارہ کے ذمہ ہوگا

۵ ۔ بل کے ذریعہ سپلائی منگوانے کی صورت میں زرِ ضمانت وصول کیا جائیگا ۔

۶ ۔ وی ۔ پی ۔ کے ذریعہ سپلائی منگوانے کیلئے کل آرڈر کی مالیت کا ⅓ حصہ پیشگی بذریعہ منی آرڈر وصول کیا جائیگا ۔

اِدارہ کی تمام مطبوعات بھی انہی شرائط پر حاصل کی جا سکتی ہیں

(سرکولیشن مینجر)